

# اقبال اور جوش کے کلام میں کربلا

<"xml encoding="UTF-8?>

شهادت حسین کی نئی معنویت کی طرف سب سے پہلے اقبال کی نظر گئی، اور اس کا پہلا بھرپور تخلیقی اظہار اقبال کے فارسی کلام میں ملتا ہے۔ اقبال کی اردو شاعری کی مثالیں بہت بعد کی ہیں۔ بال جبریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ رموز بے خودی البتہ ۱۹۱۸ء میں منظر عام پر آچکی تھی۔ اس میں "درمعنی حریت اسلامیہ و سر حادثہ کربلا" کے عنوان سے جو اشعار ہیں، یقیناً ان کو اس نئے معنیاتی رجحان کا پیش خیمه کہا جاسکتا ہے۔ یہ بات بھی بعد از قیاس نہیں کہ خود مولانا محمد علی جو بر اس معاملے میں اقبال سے متاثر رہے ہوں، کیون اقبال کے فارسی کلام کی مثالیں تو یقیناً مولانا کی زندگی کی ہیں مولانا کا انتقال ۱۹۳۱ء میں ہوا اور اس میں شک نہیں کہ اقبال کا اثر نہایت ہمہ گیر اور وسیع تھا۔ رموز بے خودی میں "درمعنی حریت اسلامیہ و سر حادثہ کربلا" سے متعلق اشعار رکن دوم میں آئے ہیں، جہاں شروع کا حصہ رسالت محمدیہ اور تشكیل و تاسیس حربت و مساوات و اخوت بنی نوں آدم کے بارے میں ہے۔ اس کے بعد اخوت اسلامیہ کا حصہ ہے، پھر مساوات کا اور ان کے بعد حربت اسلامیہ کے معنی میں سر حادثہ کربلا بیان کیا ہے۔ اس حصے میں شروع کے کچھ اشعار عقل و عشق کے ضمن میں ہیں اس کے بعد اقبال جب اصل موضوع پر آتے ہیں تو صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کردار حسین کو کس نئی روشنی میں دیکھ رہے ہیں اور کن پہلوؤں پر زور دینا چاہتے ہیں۔ حسین کے کردار میں انہیں عشق کا وہ تصور نظر آتا ہے جو ان کی شاعری کا مرکزی نقطہ تھا۔ اور اس میں انہیں حربت کا وہ شعلہ بھی ملتا ہے جس کی تب و تاب سے وہ ملت کی شیرازہ بندی کرنا چاہتے تھے۔ اور نئے نو آبادیاتی تناظر میں ہم وطنوں کو جس کی یاد دلانا چاہتے ہیں۔

درمعنی حریت اسلامیہ و سر حادثہ کربلا

ہر کہ پیمان باہو الموجود است  
گردنش از بند ہر معبد رست ...

عشق را آرام جان حریت است  
ناقہ اش راساریان حریت است

آن شنیدستی کہ ہنگام نبرد  
عشق با عقل ہوس پرور چہ کرد

آن امان عاشقان پور بتول

## سرو آزادە زبستان رسول

الله الله بائے بسم الله پدر  
معنی ذبح عظیم آمدپسرا

بهرآن شہزاده خیر الملل  
دوش ختم المرسلین نعم الجمل

سرخ رو عشق غیور از خون او  
شو خی ایں مصرع از مضمون او

در میان امت آن کیوان جناب  
بمچو حرف قل هوالله در کتاب

موسی و فرعون و شبیر و یزید  
این دو قوت از حیات آید پدید

زنده حق از قوت شبیری است  
باطل آخر داغ حسرت میری است

چون خلافت رشته از قرآن گسیخت  
حریت را زیر اندر کام ریخت

خاست آن سر جلوه خیر الامم  
چون سحاب قبله باران در قدم

برزمین کربلا بارید و رفت  
لاله در ویرانه یا کارید و رفت

تاقیامت قطع استبداد کرد  
موج خون او چمن ایجاد کرد

بهر حق در خاک و خون غلطیده است  
پس بنائے لاله گردیده است

مداعیش سلطنت بوده اگر  
خود نکرده با چنپن سامان سفر

دشمنان چوں ریگ صحرا لاتعد  
دوستان او به یزدان ہم عدد

سرابراہیم و اسماعیل بود  
یعنی آن اجمال را تفصیل بود

عزم او چوں کوہساران استوار  
پائدار و تندریس ر و کامگار

تیغ بھر عزت دین است و بس  
مقصد او حفظ آئین است و بس

ماسواله را مسلمان بندہ نیست  
پیش فرعونے سرش افگنده نیست

خون او تفسیر این اسرار کرد  
ملت خوابیده را بیدار کرد

تیغ لاقوں ازمیان بیرون کشید  
از رگ ارباب باطل خون کشید

نقش الا الله بر صحرا نوشت  
سطر عنوان نجات ما نوشت

رمز قرآن از حسین آموختنیم  
زاوش او شعله ہا اندوختنیم

شوکت شام و فربغداد رفت  
سطوت غرناطہ ہم ازیادرفت

تارما از زخمہ... اش لرزان ہنوز

تازه از تکبیراد اوایمان ٻنوز

اے صبا اے پیک دور افتادگان  
اشک مابرخاک پاک او سان

رموز بیخودی ہی میں ”درمعنی این کہ سیدة النسا فاطمته الزیرا اسوه کاملہ ایسٹ برائے نساء اسلام“ کے ذیل میں بھی حسین کا ذکر آیا ہے۔

درنوائے زندگی سوز از حسین  
اہل حق حریت آموز از حسین

سیرت فرزندیا از امہات  
جوہر صدق و صفا از امہات

مزرع تسلیم را حاصل بتول  
مادران را اسوه کامل بتول

اس کے فوراً بعد ”خطاب به مخدرات اسلام“ میں یہ حوالہ پھر آیا ہے۔

فطرت تو جذبہ پا دار بلند  
چشم ہوش از اسوه زبر مبند

تاحسینی شاخ تو بار آورد  
موسم پیشین به گلزار آورد

پھر یہ حوالہ زبور عجم ۱۹۶۷ء کی ایک غزل کے اس زبردست شعر میں ملتا ہے۔  
ریگ عراق منتظر کشت حجاز تشنہ کام  
خونِ حسین باز دہ کوفہ و شام خویش را ریگ عراق منتظر ہے، کشت حجاز تشنہ کام ہے، اپنے کوفہ و شام کو  
خونِ حسین پھر دے، اس میں حال کا صیغہ اور کوفہ و شام خویش نئی فکر کے غماز ہیں، یعنی پھر وہی تشنگی

کا منظر ہے اور موجودہ حالات میں تمہارے کوفہ و شام کو خون حسین کی پھر ضرورت ہے۔ یہ تھی وہ تڑپ اور آگ جو اقبال کو بار بار اس حوالے کی طرف لے آتی تھی۔

جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) میں سلطان شہید (ٹیپو سلطان) کا ذکر کرتے ہوئے اسے "وارث جذب حسین" کہا ہے۔ پس چہ باید کرد (۱۹۳۶ء) میں بھی "فقر" اور "حرفی چند بالامت اسلامیہ" کے ذیل میں حسین کا حوالہ آیا ہے۔

فقرِ عربیان گرمی بدر و حنین  
فقرِ عربیان بانگ تکبیر حسین

ارمغان حجاز (۱۹۳۸) میں فرماتے ہیں:

اگرپندے ز درویشے پذیری  
ہزار امت بمیرد تو نہ میری

بتولے باش و پنہاں شوازیں عصر  
کہ در آغوش شبیرے بگیری

آخری مجموعہ ارمغان حجاز جو اقبال کے انتقال کے کچھ مہ میں شائع ہوا۔ اس شعر پر ختم ہوتا ہے۔

ازان کشت خرابے حاصلے نیست

کہ آب از خون شبیرے ندارد! اقبال فارسی میں بھی جو کچھ کہتے تھے، پوری اردو دنیا میں اس سے ارتعاش پیدا ہوتا تھا۔ رئائی ادب سے ہٹ کر نئے تناظر میں اس تاریخی حوالے کی اہمیت کا ذکر اردو دنیا کے لیے ایک بالکل نیا موضوع تھا۔ اقبال کی اردو شاعری میں اس موضوع کی گونج پہلی بار بال جبریل (۱۹۳۵ء) کی غزلوں اور نظموں میں سنائی دیتی ہے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے کلام کے پیش نظر اقبال کے یہاں حسین 'شبیر' مقام شبیری 'اسوہ شبیری' باقاعدہ تھیم کا درجہ رکھتے ہیں۔ ذیل کے اردو اشعار اس سلسلے میں بے حد اہم ہیں۔ ان کو اس رحجان کے اولین سنگ میل سمجھنا چاہئے۔ نئے نو آبادیاتی تناظر میں ان کی معنویت غور طلب ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان اشعار نے بعد کے شعرا کے لیے اس تاریخی حوالے کے نئے علامتی ابعاد کو روشن نہ کیا ہوگا۔

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری  
بدلے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

غريب و ساده و رنگيں ہے داستان حرم  
نہایت اس کی حسین، ابتدا ہے اسماعيل اقبال کے اس تخلیقی رویے کا اثر بعد میں آنے والے شاعروں پر رفتہ رفتہ مرتب ہوا اور یوں آہستہ آہستہ شعری اظہار کی ایک نئی راہ کھل گئی۔ بال جبریل کی مختصر نظم "فقر" کا نقطہ عروج بھی کئی فارسی نظموں کی طرح سرمایہ شبیری ہی ہے۔

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری  
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری

اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری

اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری  
میراث مسلمانی' سرمایہ شبیری

لیکن انتہا درجہ کی حسن کاری اور حد درجہ شدت احساس کے ساتھ یہ حوالہ بال جبریل کی شاہکار نظم "ذوق و شوق" کے دوسرے بند میں ابھرتا ہے۔ اختتامی بیت میں تطبیق 'تصور عشق سے کی گئی ہے جو اقبال کامرکزی موضوع ہے۔

صدق خلیل بھی ہے عشق' صیر حسین بھی ہے عشق  
معركہ وجود میں' بدر و حنین بھی ہے عشق

لیکن اسی بند کا یہ شعر:

قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں

گرچہ ہے تاب دارا بھی گیسوئے دجلہ و فرات بالخصوص اس کا پہلا مصرع تو ضرب المثل کا درجہ احتیار کرچکا ہے۔ شاعر ترپ کر کہتا ہے کہ ذکر عرب عربی مشاہدات سے اور فکر عجم عجمی تخیلات سے تھی ہوچکے ہیں۔ کاش کوئی حسین ہو جو زوال و غفلت کے اس پرآشوب دور میں حریت و حق کوشی کی شمع روشن کرے۔ رموز بے خودی ۱۹۱۸ء میں بال جبریل ۱۹۳۵ء میں اور ارمغان حجاز ۱۹۳۸ء میں منظر عام پر آئیں۔ لگ بھگ اسی زمانے میں جوش مليح آبادی کے یہاں بھی شہادت حسین کا حوالہ سے انقلابی ابعاد کے ساتھ لگتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یوں تو جوش مليح آبادی نے ذاکر سے خطاب اور سوگواران حسین سے خطاب" جیسی نظمیں بھی لکھیں جن کا مقصد اصلاح تھا' لیکن شہادت حسین کی انقلابی معنویت کی طرف اشارے انہوں نے "رثائی ادب" کے دائڑھی میں رہ کر کیے۔ شعلہ و شبنم میں اس نوعیت کا جتنا کلام ہے' اس کے بارے میں خود جوش نے وضاحت کر دی ہے کہ یہ تمام نظمیں ۱۹۲۷ء سے پہلے کی ہیں جوش ان منظومات کو بھلے ہی زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوں' کردار حسین کی انقلابی معنویت کو روشن کرنے میں جوش کی شاعری نے نہایت اہم خدمات انجام دیں۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ان کا پہلا مرثیہ جو "آواز حق" کے نام سے شائع ہوا' اور جس کے آخری بند میں واضح طور پر جوش نے صدیوں کی تاریخ کا سلسلہ اپنے عہد کی سامراج دشمنی سے ملا دیا' ۱۹۱۸ء کی تصنیف ہے۔ اقبال کی شہرہ آفاق تصنیف رموزی خودی بھی (جس سے ہم درمعني حریت اسلامیہ و سر حادثہ کربلا اور متعدد دوسرے حوالے پیش کرچکے ہیں) میں شائع ہوئی۔ یہ پہلی جنگ عظیم کے اختتام کا اور تحریک خلافت کے تقریباً آغاز کا زمانہ تھا۔ جوش کا یہ بند ملاحظہ ہو جس میں وہ دعوت دیتے ہیں کہ اسلام کا نام جلی کرنے کے لیے لازم ہے کہ ہر فرد حسین ابن علی ہو۔

اے قوم! وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ  
اسلام ہے پھر تیر حوادث کا نشانہ

کیوں چپ ہے اسی شان سے پھر چھیڑ ترانہ

تاریخ میں رہ جائے گا مردؤں کا فسانہ

مٹتے ہوئے اسلام کا پھر نام جلی ہو  
لازم ہے کہ ہر فرد حسین ابن علی ہو

واضح رہے کہ "آواز حق" کو شعلہ و شبنم میں شامل کرتے وقت جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی جوش نے اعتذار کا لرجہ اختیار کیا اور یہ نوٹ درج کیا "اس نظم کو صرف اس نظر سے پڑھا جاسکتا ہے کہ یہ آج سے اٹھارہ برس پیشتر کی چیز ہے۔ (ص ۲۲۸)۔

یوں تو جوش ملیح آبادی نے نو مرثیے لکھے جنہیں ضمیر اختر نقوی نے مرتب کرکے شائع کر دیا ہے (جو ش ملیح آبادی کے مرثیے لکھنے کا آزادی سے پہلے "آواز حق" کے علاوہ جوش کا صرف ایک اور مرثیہ "حسین اور انقلاب" ملتا ہے جو ۱۹۳۱ء کی تصنیف ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے انقلابی خیالات کا اظہار اور بھی کھل کر کیا ہے اور کئی بندوں میں حسین کو حریت و آزادی کے مظہر کے طور پر پیش کیا ہے۔ چالیسویں بند کی بیت ہے۔

عباس نامور کے لہو سے دھلا ہوا  
اب بھی حسینیت کا علم ہے کھلا ہوا

\*\*\*

اس کے بعد کچھ بند ملاحظہ ہوں۔

یہ صبح انقلاب کی جو آج کل ہے ضو  
یہ جو مچل رہی ہے صبا پھٹ رہی ہے پو

یہ جو چراغ ظلم کی تھرا رہی ہے لو  
در پردہ یہ حسین کے انفاس کی ہے رو

حق کے چھڑے ہوئے ہیں جو یہ ساز دوستو  
یہ بھی اسی جری کی ہے آواز دوستو

پھر حق ہے آفتاں لب بام اے حسین  
پھر بزم آب و گل میں ہے کھرام اے حسین

پھر زندگی ہے سست و سبک گام اے حسین  
پھر حریت ہے مورد الزام اے حسین

ذوق فساد ولولہ شر لیے ہوئے  
پھر عصر نو کے شمر ہیں خنجر لیے ہوئے

مُجْرُوحٌ بَهْرٌ بِهِ عَدْلٌ وَ مَسَاوَاتٌ كَ شَعَارٍ  
اس بیسویں صدی میں ہے بَهْرٌ طَرْفَهُ اَنْتَشَارٍ

بَهْرٌ نَائِبٌ يَزِيدٌ بَيْنَ دُنْيَا كَ شَهْرٌ يَارٌ  
بَهْرٌ كَرْبَلَائِيٌّ نَوْ سَهْنَ بَيْنَ نَوْ بَشَرٌ دُوْچَارٌ

اَهِ زَنْدَگَى جَلَالٌ شَهْ مَشْرُقِينَ دَهْ  
اس تازہ کربلا کو بھی عزم حسین دَهْ

آئِنْ كَشْمَكَشٌ سَيْ سَيْ بَيْنَ دُنْيَا كَ زَيْبٌ وَ زَيْنٌ  
ہَرَگَامٌ اَيْكَ بَدْرٌ "بَرْ ہُوْ سَانْسٌ اَكَ" "حَنْيَنْ"

بَرْ ہَتَيْ رَبِيْوَيْوَ نَهِيْنَ پَيْ تَسْخِيرٌ مَشْرُقِينَ  
سَيْنُونَ مَيْنَ بَجْلِيَانَ ہُونَ زَبَانُونَ پَهْ "يَاحْسَيْنَ"

تَمَ حَيْدَرِيٌّ بُوْ سَيْنَهُ اَزْدَرَ كَوْ پَهَاظُ دَوْ  
اس خَيْبَرَ جَدِيدَ كَا درَ بَهِيَ اَكْهَاظُ دَوْ

\*\*\*

اس مَرْثِيَهُ كَ خَاتَمَهُ اَسَ بَيْتٌ پَرَ ہُوا ہَيْ-

دُنْيَا تَرِي نَظِيرِ شَهَادَتٍ لَيْ بَوْئَيْ  
اَبَ تَكَ كَهْرِيٌّ بَهِ شَمَعٌ بَدَائِيَتٍ لَيْ بَوْئَيْ

\*\*\*

جَوْشٌ مَلِيْحٌ آبَادِيٌّ نَهِيْ اَسِيَ زَمَانَهُ مَيْنَ كَهْ

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو  
ہر قوم پکارتے گی ہمارتے ہیں حسین

اس سلسلے میں جوش کے ایک سلام کے یہ شعر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، جس میں عہد نو کی صاف گونج موجود ہے۔

محراب کی ہوس ہے نہ منبر کی آرزو  
ہم کو ہے طبل و پرچم ولشکر کی آرزو

اس آرزو سے میرے لہو میں ہے جزو مدد  
دشت بلا میں تھی جو بہتر کی آرزو

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ جوش رثائی ادب کی کلاسیکی روایت سے جو مذہبی مقصد کے لیے مخصوص تھی، سیاسی نوعیت کا کام لے رہے تھے، اس پر کچھ اعتراض بھی ہوئے۔ بالیں ہم اس کا اعتراف بھی کیا گیا کہ ”جوش نے مرثیے میں انقلاب اور قومی آزادی کے تصور کو رواج دیا“ تاہم رثائی ادب کی اپنی حدود تھیں، جن کا احترام مرثیہ گو شعرا کے لیے واجب تھا۔ جوش کی البیلی شخصیت کی بات ہی اور تھی۔ وہ اپنی رومانیت اور بغاوت کی وجہ سے پر چیز کو نبھالے جاسکتے تھے۔ دوسروں کے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ جمیل مظہری نے کچھ کوشش کی لیکن ان سے چلا نہیں، اور اس کا چلنا ممکن بھی نہیں تھا۔ ان کوششوں کے برعکس، اقبال اور محمد علی جوہر نے نظم اور غزل میں کردار حسین کی عظمت کے بلاواسطہ اور بالواسطہ تخلیقی اظہار کی جو راہ دکھائی تھی۔ اس نے آنے والوں کے لیے ایک شاہراہ کھول دی۔ اور بعد کی اردو شاعری میں اس رجحان کا فروغ دراصل انہیں اثرات کے تحت ہوا۔